ماہ لقا

اور دوسری نظمیں

عزیز احمد

سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادبیاتِ اُردو شمارہ (۹۱)

ماہ لقا

اور دوسری نظمیں

از

عزیز احمد

بی۔ اے۔ آنرز (لندن)
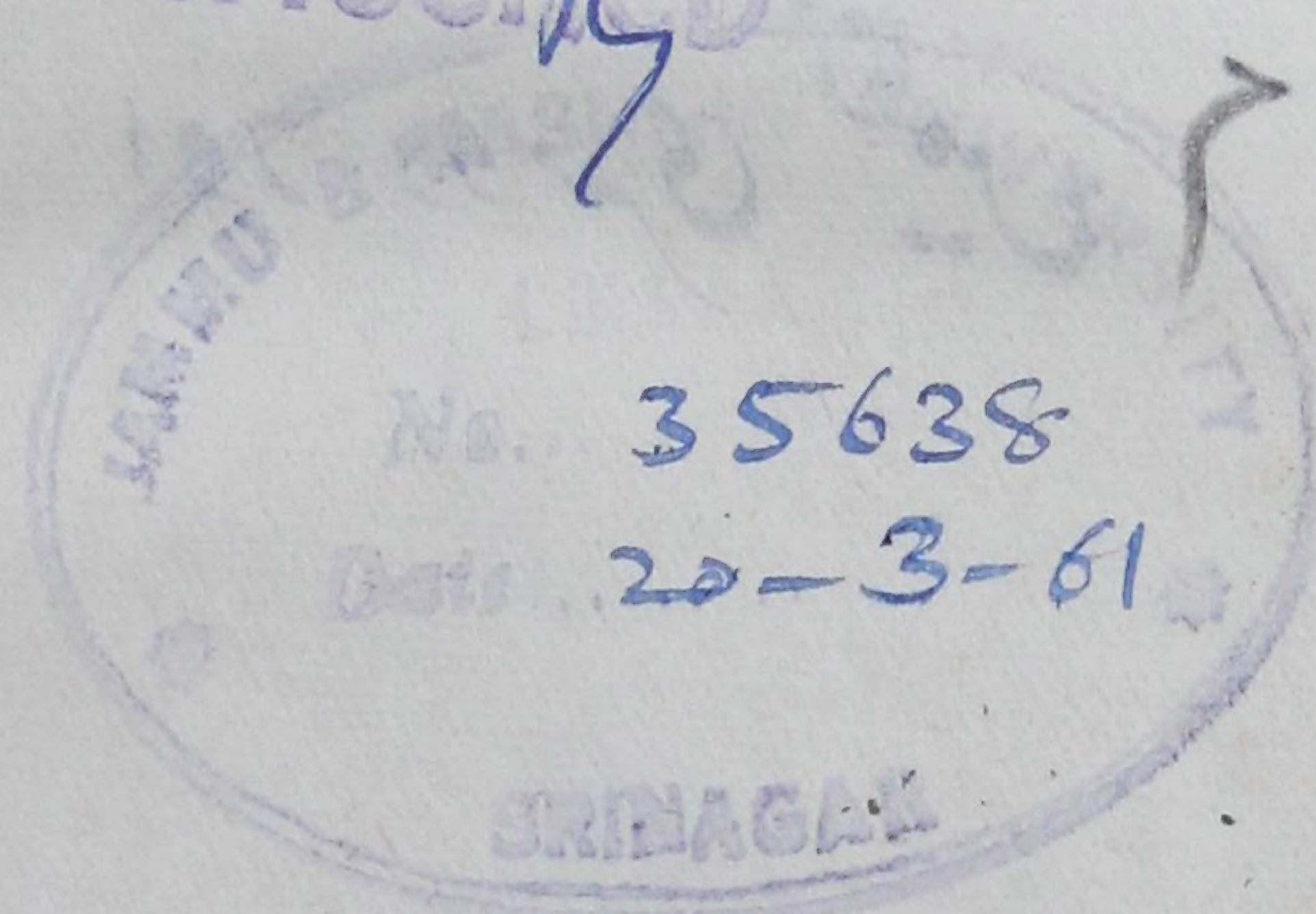
۱۹۴۳ء

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس
حیدر آباد دکن

ملنے کا پتہ سب رس کتاب گھر
رفعت منزل خیریت آباد

قیمت ایک روپیہ

فہرست

انتساب

TO

MORTON W. BLOOMFIED

IL PRIMO MIO AMICO.

تمہید

(۱)

اب سے چند ہی سال قبل کا ذکر ہے کہ مشرق اور مغرب کو ایک دوسرے کی ضد سمجھا جاتا تھا۔ مغربی سامراج اس نظریہ سے سیاسی اور معاشی وجود کی بنا پر مطمئن تھا۔ مشرق کو اپنے غرورِ قدامت پرستی اور آبا پرستی میں یہ نظریہ اچھا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن ذرایع رسل و رسائل اور ذرائع آمد و رفت نے اب دنیا بھر کو ایک بنا دیا ہے اور سب تمدن، یورپ کے تمدن میں ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ پہلی مرتبہ دنیا کو ایک عام اور ایک مشترک تمدن مل رہا ہے۔

لیکن یہ تمدن زخم خوردہ ہے۔ ریڈیو کے ساتھ مشین گن بھی مغرب اور مشرق کو ایک کڑی میں باندھ رہی ہے۔ شاعری تمدن کی جراحتوں سے بہت جلد متاثر ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی کے آخر اور اِس صدی کے شروع سے یورپ کی شاعری اس سے متاثر ہے۔ یورپ کی شاعری کی تمام جدید تحریکات رمزیت Symbolism

تصوریت Imagism مستقبلیت Futurism
اظہاریت Expressionism سب پر اس کا اثر ہے۔
ایک طرح سے دیکھا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تمام تحریکیں حقیقت نگاری کی ترقی یافتہ صورتیں ہیں۔ حقیقت نگار کے سامنے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ حقیقت بہ وقت واحد ایک سے زیادہ مدارج پر نمودار ہوسکتی ہے۔ یہ سب تحریکیں حقیقت کے اس پہلو کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ گو بالکل الگ الگ طریقوں سے۔ جو بظاہر اورائے حقیقت معلوم ہوتا ہے، لیکن دراصل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید مغربی شاعری سمجھنے میں دقّت پیش آتی ہے اور کبھی کبھی تو اس شاعری کے معانی بے حد مبہم، شاذ و نادر، مہمل معلوم ہوتے ہیں۔

میں نہیں سمجھتا کہ ان میں سے کسی تحریک کی پیروی ہمارے لئے مناسب ہے اور نہ میں نے ان تین نظموں میں کسی مکتب، یا کسی تحریک کی باقاعدہ پیروی کی کوشش کی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ چونکہ موجودہ ہندوستان اور موجودہ یورپ کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل دن بدن یکساں ہوتے جا رہے ہیں، ان حالات کا بھی ہمارے شاعروں کے کلام پر اثر پڑے گا اور پڑ رہا ہے۔ اس کے علاوہ جدید مغربی شاعری

ہمارے نوجوانوں کے پیشِ نظر ہے۔ ظاہر ہے کہ اُس طرزِ ادا
اس طرز خیال کا بھی کچھ نہ کچھ اثر ہونا ضروری ہے۔
اس کے علاوہ انوکھی اور نئی چیز ہمیشہ اچھی معلوم ہوتی ہے۔
اس مجموعے میں تین طویل نظمیں ہیں۔ پہلی "ماہ لقا" جو
۱۹۳۰ء میں لکھی گئی، ایک عشقیہ نظم ہے۔ دوسری نظم
"عمر خیام" ۱۹۳۲ء میں لکھی گئی۔ اس منظوم ڈرامے پر
جدید مغربی تحریکات کا تقریباً کوئی اثر نہیں۔ تیسری اور
آخری نظم جو ۱۹۴۲ء کی لکھی ہوئی ہے مغربی طرزِ خیال اور طرزِ
بیان سے سب سے زیادہ متاثر ہے۔

(۲)

"ماہ لقا" کا پہلا حصّہ ایک طرح کا تمہیدی منظر ہے۔
ستاروں کی انجمن کی مثال میں رمزیت ہے۔ ستارے ایک
نظام کے پابند ہیں جس کی خلاف ورزی مشیّت کے خلاف
ہے۔ اگر زحل زمین کے چاند سے عشق کرنا چاہے تو اُسے
کامیابی نہیں ہوسکتی۔ یہ تمہیدی منظر اور اس کا مطلب نظم
کے لئے وہی کام دیتا ہے جو Overture اوپیرا کے لیے۔
اسی سے اُس حزنیہ انجام کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے جس پر
نظم ختم ہوگی، کیونکہ اگر ستارے اپنی کشش میں مشیت کے
عائدکردہ حدود کے پابند ہیں تو انسان کی نفسیات، اور انسانوں

کی باہمی کشش بھی ایک حیاتیاتی نظام کی پابند ہے۔
"ماہ لقا" کے نام ہی کو چاند سے بہت مشابہت ہے۔ ستاروں میں زہرہ اور چاند دو ہی حسن کی وجہ سے مشہور ہیں۔ مگر مشرق کی روایات میں حُسن کی ملکہ چاند ہے۔ چاند سے مشرقی شاعری کا تخییل اکثر وابستہ رہا ہے اور میر کی مثنوی خواب دِل میں شاعر کا تخییل اتنا بے قابو ہو جاتا ہے کہ وہ چاند کی دیوی کو چاند سے نکل کے اپنے پاس آتا دیکھتا ہے اور اُسی کے خیال اور فراق میں مجنوں سا ہو جاتا ہے۔ لیکن یہاں جدید عاشق میر سے نظم کے تیسرے حِصّے میں صاف صاف کہہ دیتا ہے کہ اگرچہ کہ اُس کی محبوبہ اور چاند میں بھی ایک طرح کا تلازم اور ایک نسبت ہے، لیکن اس کی محبوبہ کوئی خیالی پیکر نہیں، بلکہ ایک زندہ عورت ہے۔
اس کے بعد کا حصہ تاریخی ہے۔ عاشق بچپن سے اپنی محبوبہ کو جانتا تھا! جوانی کے بعد عاشق کے شعور نے اُسی لڑکی میں ایک نئی کیفیت محسوس کی۔ آخری شعر میں جب محبوبہ اپنا نام بتاتی ہے تو گویا وہ اس کو دانستہ طور پر اور بلا ارادہ قائل کر رہی ہے کہ مشرقی روایات کی بنا پر وہ وہی خیالی پیکر ہے جو چاند سے نسبت رکھتا ہے اور جس سے عشق واجب ہے۔

اس کے بعد یک لخت منظر بدلتا ہے۔ عاشق پیرس کی ایک شام کا حال بیان کرتا ہے۔ مشرقی حُسن مغربی جمال و آرائش کے پس منظر میں بھی ممتاز معلوم ہوتا ہے اور شاعر کو ماہ لقا یاد آتی ہے۔

یورپ کے تعشّقات ماہ لقا کے خیال کو محو نہیں کرسکتے۔ سینوریتا سے عاشقی کرتے وقت یہ خیال دل کے نشیب میں اچھی طرح جاگزیں ہے؛ اور اسی کی وجہ سے سینوریتا کے ساتھ عاشق کا اظہارِ عشق، دونوں کو کھیل معلوم ہوتا ہے۔ سونیا سے عاشقی کرنے کے زمانے میں ماہ لقا کا خیال اتنا اثر کرچکا ہے، کہ سونیا سے شاعر کا سنجیدہ عشق اندر سے کھوکھلا ہے، اور وہ، اور اس کی سہیلیاں اس کو محسوس کرتی ہیں۔

جنّتِ شداد پھر ایک رمزِ مطلق ہے۔ شداد کا سب سے بدتر گناہ خود نمائی اور خود پرستی تھا۔ یہی وہ گناہ ہے جو فطرتِ نسوانی کو سب سے زیادہ پسند ہے۔ طیور وغیرہ وہ تعریف کرنے والے ہیں جن کی تحسین و ستائش سے نوجوان لڑکیاں اپنے حسن پر غرور کرنے لگتی ہیں۔ یہ ٹکڑا نظم کے درمیان ایک طرح کا رمزی Intermezzo ہے، اور نظم کے آیندہ حِصّے کی پیشین گوئی بھی کرتا ہے۔

اس کے بعد جو ٹکڑا ہے، وہ دانتے کی "حیات نو"

کی ایک نظم سے کسی قدر متاثر ہے۔ ایک بار بیاترچے کو ایک مجلس میں دیکھ کر دانتے اس قدر بے خود ہو گیا کہ تھر تھر کانپنے لگا۔ سب خواتین، اور ان کے ساتھ بیاترچے اُس کی یہ حالت دیکھ کر ہنسنے لگیں۔ دانتے نے بیاترچے سے اس نظم میں شکایت کی ہے کہ خاتون اور سب خواتین کے ساتھ مِل کر آپ نے میری ہنسی اڑائی اور یہ خیال نہ فرمایا کہ کیوں میرا یہ حال ہوا۔ ناظرین پر واضح ہو گیا ہو گا کہ دانتے کی اس نظم کا اثر میرے اس ٹکڑے پر بالکل جزوی ہے۔ میں نے صرف دانتے کا Milieu (ماحول) ذرا تبدیلی کے ساتھ یہاں منتقل کر لیا ہے۔ بہرحال یہاں عاشق کی قسمت پر مُہر لگ جاتی ہے۔ اس کی محبوبہ اپنی اُس رائے کا اظہار کرتی ہے، جس کو انشا نے بالکل دوسرے پیرائے میں یوں بیان کیا تھا ؎

میں ہوں ہنسوڑا اور تو ہے منقطع، میرا تیرا میل نہیں۔

اب نااُمیدی کے سوا عاشق کے پاس اور کیا باقی رہ سکتا ہے! اُسے اپنی جوانی کے تلف ہونے کا افسوس ہے۔ وریلین Verlaine کا ایک مصرعہ "کمبخت تو نے اپنی جوانی کو کیا کیا!" نااُمیدانہ سلسلۂ خیال کا محور ہے۔ جہاں عاشق کو محبت کا جواب محبت سے ملا، وہاں اُس نے موقعے گنوائے اور اب عشق بھی کیا تو کس سے؟

دِل کی مایوسی کا بہترین علاج دماغ کی مصروفیت ہے۔ اس لیے اقبال کے کلام میں شاعر پناہ ڈھونڈھتا ہے، اور اقبال سے مدارجِ عشق کا خلاصہ سُنتا ہے۔

اس سے اس کی تسکین نہیں ہوتی۔ نظم کے خاتمے پر وہ غزل کے رومانوی ماحول میں پناہ لیتا ہے جہاں حسرت اور نا امیدی میں عشق، جاودانی اور ابدی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ رومانیت مشرقی نوجوان کے ذہن کی سب سے بڑی بیماری ہے۔ اُسے اقبال کی آواز سنائی دیتی ہے کہ اس قسم کے نوجوان دنیا میں کیا کام کر سکیں گے:۔

نہیں ہنگامۂ پیکار کے لائق وہ جواں
جو ہوا نالۂ مُرغانِ چمن سے مدہوش

——۔(۳)۔——

دوسری نظم "عمر خیام" مقابلتاً بہت سیدھی سادی ہے۔ جدید تاریخی تحقیق سے ثابت ہے کہ عمر خیام نظام الملک اور حسن بن صباح کے ہم مکتب ہونے کی داستان غالباً غلط ہے۔ لیکن شاعری کی نظر میں روایت اور تحقیق سب برابر ہیں۔ چنانچہ عمر خیام کا کردار شاعری کی عظمت کا مظہر ہے، نظام الملک کا کردار راستی کا نمونہ ہے، اور حسن بن صباح کا کردار

شر برائے منفعت کا آئینہ دار ہے۔ لیکن یہ کردار اپنی خصوصیتوں کے محض مظاہر نہیں۔ وہ Humour جانسن کے معنوں میں) بھی ہیں اور کردار بھی۔ ان کے خصائص کی جنگ سے زندگی کے معانی حل ہوتے ہیں، ان کے کرداروں کی جنگ سے ڈراما کے نفسیاتی واقعات کا ارتقا ہوتا ہے۔ خیر اور شر دونوں اپنا اپنا کام کر کے ختم ہوتے ہیں لیکن شاعری کی سرحد اِن دونوں سے ماورا ہے۔ شاعری جس کی بنیاد خیر محض ہے، خیر و شر کے معرکے سے بالاتر ہے۔

زمان و مکان کے قیود و حدود کو ڈرامائی صورت کے مدِّنظر توڑ دیا گیا ہے۔ اس طرح نظام الملک کے سوگ کے منظر ہی میں حسن بن صبّاح کی موت کی خبر دی گئی ہے۔ لیکن یہ آزادی اس لئے لی گئی ہے کہ ڈرامائی ضرورت کو 'افسانیاتی' ضرورت پر مقدم سمجھا گیا۔

یہ ڈرامہ اب سے تقریباً دس سال پہلے کا لکھا ہوا ہے اور اس سے پہلے رسالۂ 'اردو' اور ادارۂ ادبیاتِ اردو کے مجموعۂ 'شعرائے عثمانیہ' میں شائع ہو چکا ہے۔

———(۴)———

"فردوس بر روئے زمیں" جو اس مجموعے کی آخری نظم ہے، سب سے آخر میں لکھی گئی اور کئی لحاظ سے یہ بہت

پیچ در پیچ ہے۔

یہ نظم ایک 'نقل' Parody سے شروع ہوتی ہے۔ پنجاب میں م ن راشد وغیرہ نے نظم آزاد کی جو گت بنائی ہے، اس نظم کا ابتدائی ٹکڑا اسی کا مذاق اڑاتا ہے۔ اس ابتدائی ٹکڑے میں کشمیر کے متعلق جدید جغرافیائی دریافتوں کو ایک مضحکہ خیز طریقے پر بیان کیا گیا ہے۔ یہ کشمیر کا جغرافیائی تعارف بھی ہے، اور نظم آزاد کی غلط روی پر اعتراض بھی،

اس کے بعد ہی نظم سنجیدہ ہونے لگتی ہے، فطرت کی لاکھوں سال کی سرگذشت میں انسان کا حصہ کتنا حقیر اور مختصر ہے۔ حقیر اور مختصر ہونے کی حد تک بھی کوئی ہرج نہ تھا، لیکن وہ حیوانیت جس کو انسان اب تک محو نہ کر سکا، اب بھی اس کی بدقسمتی کا باعث ہے۔

اس کے بعد نظم کے پیرایہ پر رمزیت Sombolism بالکل غالب آجاتی ہے۔ سری نگر میں دریائے جہلم کی روانی ایک رمز ہے۔ جو تشبیہیں اس روانی کے ماحول اور فطرت اور انسان کے تعلق کو پیش کرتی ہیں، وہ تصوریت کے اصول کے مطابق نمایاں اور اجاگر نہیں بلکہ 'رمز' بنتی جاتی ہیں۔ میں نے فرانس کے رمزی مکتبِ خیال کے اصول کے مطابق اس نکتہ پر عمل کیا ہے..............

........Que Le Domaine De La Poesie Commençe Avec Les Impressions Vagües Et Subtiles; Qu'on Doit, Au Lieu De Nommer Les Objets, En E'voquer L'idee Au Moyen D'images, Qvi En Sont Le Symbole.

رمزیت کی یہ تعریف جو میں نے ایک تاریخِ ادبیاتِ فرانس سے نقل کی ہے، نظم کے اِس حِصّے اور اس کے بعد کے ایک حِصّے پر صادق آتی ہے۔ شاعر کی سرحد مُبہم اور لطیف تاثرات سے شروع ہوتی ہے۔ بجائے اس کے کہ اشیا کے نام لئے جائیں ان کا تصوّر ایسی تشبیہوں سے اُجاگر کیا جائے جو ان کے لئے "رمز" بنیں؛ ان کی طرف اشارہ کریں۔

اس تعریف کو مدنظر رکھ کے اگر یہ ٹکڑا جو سری نگر میں جہلم کے متعلق ہے، اور پھر وہ ٹکڑا جو گلمرگ (گلمرگ کی شکل پیالے کی سی ہے) کے متعلق ہے پڑھا جائے تو مطلب سمجھنے میں کوئی خاص دقت نہ ہوگی۔

جھیل ڈل کے کنارے چار باغ ہیں۔ جہانگیر کے زمانے میں یہ مصرعہ صادق آتا تھا "صُبح در باغِ نسیم و شام در باغِ نشاط" اب انگریزوں نے نگین باغ کو شام کی خاص عشرت گاہ بنالیا

ہے؛ اسی لئے میں نے بھی ذرا تصرف کیا ہے۔ داراشکوہ کا ذکر اس سلسلے میں آیا ہے کہ پری محل کو اُس کی رہائش گاہ بتایا جاتا ہے، جہاں سے ڈل کا منظر بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مورّخ اُن شخصیتوں کو یاد کرے گا جو عمارتوں اور باغات کے پیچھے ہیں۔ دلبری بے قاہری اور دلبری باقاہری اقبال کے فلسفۂ حُسن و فن کی اصطلاحیں ہیں، جن سے اقبال کے ناظرین اچھی طرح واقف ہوں گے۔

وادیٔ سندھ کی تعریف میں جو ٹکڑا ہے، وہ قدیم اور متوسط دور کی فارسی شاعری کا چربہ ہے۔ نہ اس میں کوئی خاص بات ہے نہ کوئی دشواری۔

سونا مرگ کی تعریف میں جو طرز اختیار کیا گیا ہے وہ انگریزی اور امریکی شاعری کے اسلوبِ تصوریت سے متاثر ہے۔ تشبیہہ یہاں مُبہم اور لطیف نہیں بلکہ مسلسل ہے، اور اس کا مقصد تمثیلی مصوّری ہے۔ تشبیہہ جامع اور مکمّل اس لیے نہیں کہ ایسا ہوتو تشبیہہ کی وجہ حیات ہی باقی نہیں رہتی۔

وُلر کے متعلق جو بند ہے وہ اقبال کے اس مصرعے کے گرد گردش کرتا ہے کہ:۔ ؎ خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے یہ ٹکڑا یہی کہنا چاہتا ہے کہ اقبال اور خضر دونوں دراصل ایک ہیں۔ جھیل جو دلدل کے قلب میں ہے، صاف اور متحرک اور متلاطم ہے۔ دلدل جو اس کے اطراف ہے، گندہ اور جامد اور بے حرکت ہے۔ اس سے دو طرح کی تمثیلیں پیدا ہوتی ہیں۔

انسانوں کے درمیان فطرت زندہ اور خوبصورت اور متحرک ہے۔ اور کشمیریوں کے باطن میں عمل کی چنگاری باقی ہے، صرف ظاہر مردہ، افسردہ اور بے ذوقِ عمل ہے۔ اقبال نے ملازاد ضیغم لولابی کشمیری کے بیاض میں اسی کا تجزیہ اور اسی کی تشیخ کی ہے، اور اسی کا مداوا خضر بن کے ولر کے کنارے سوچا ہے

آخری ٹکڑا ایک غریب کشمیری جمالدار کے متعلق ہے۔ اس کی زندگی کے مختلف پہلو، اس کے گھریلو معاملات، اس کے سیاسی خیالات سب جھلک کی طرح اس ٹکڑے میں نظر آتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے نظم آزاد Vers Libre ہی کو استعمال کیا ہے۔ ٹی۔ اس۔ ایلیٹ نے جو تحریک تصوریت Imagism کے بانیوں میں سے ہے نظم آزاد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ عہد الزبتھ کی نظم عاری Blank Verse ہی سے بڑی حد تک مشابہہ ہے۔ نواب عابد نواز جنگ بہادر نے اسی اصول کو پیش نظر رکھا کہ نظم عاری میں ہملٹ کے کچھ حصّوں کا ترجمہ کیا۔ لیکن نظم عاری اور نظم آزاد کی حال حال میں پنجاب میں بڑی گت بنائی گئی ہے، اور اسی کی نقل میں نے "فردوس برروئے زمیں" کے پہلے ٹکڑے میں کی ہے۔ آخری ٹکڑا جو میں نے نظم آزاد میں کیا ہے، اس نوع کا سنجیدہ استعمال ہے۔ اگر نظم آزاد کو مکالمہ، اور انتہائی معمولی اور

سادہ باتوں کے اظہار کے لئے استعمال کیا جائے تو یہ اچھی خاصی طرح کامیاب ہوسکتی ہے، اور اگر اس سے شاعرانہ جمناسٹک کا کام لیا جائے تو ظاہر ہے کہ یہ اس کی متحمل نہیں ہوسکتی۔
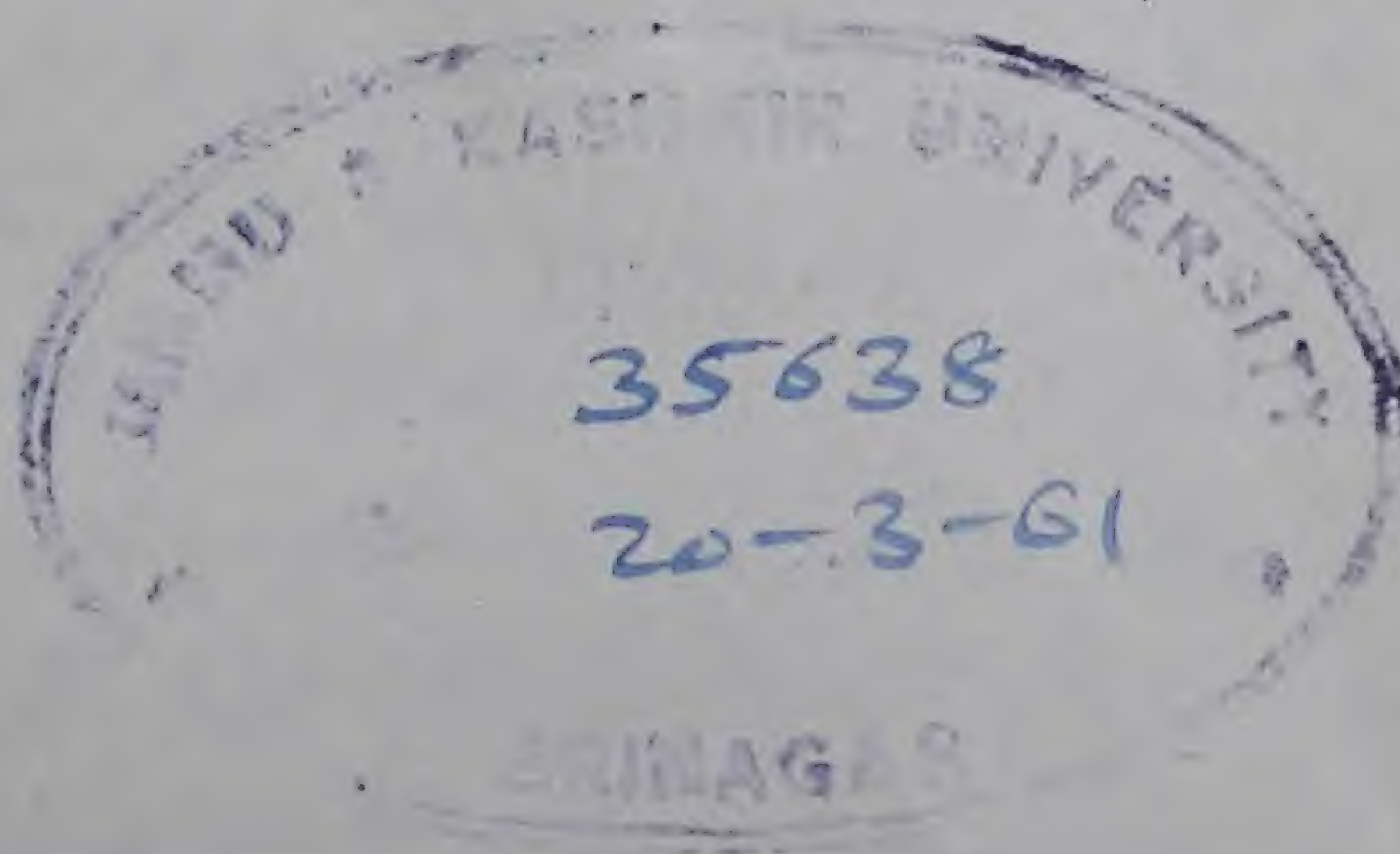
ماہ لقا

ایک ڈرامائی نظم

سنہ ۱۹۳۸ء

مقدمہ

Ein Juengling Liebt ein Maedchen,
Die hat einen andern erwaehlt;
Der andre liebt eine andre,
Und hat sich mit dieser vermaehlt.
Das Maedchen heiratet aus Aergei
Den ersten, Besten Mann,
Der ıhr in den Weg gelaufen;
Der Juenging ist uebel dran,

لہ ایک نوجوان کو ایک لڑکی سے محبّت ہے۔ لڑکی نے کسی دوسرے کو چُنا ہے۔ یہ دوسرا کسی اور کو چاہتا ہے اور اُس سے شادی کر لیتا ہے۔
لڑکی غُصّے میں آکے اُس سب سے ٹھیک آدمی سے شادی کرلیتی ہے جو پہلے سے راستے میں ملتا ہے۔ اس پر نوجوان کو بڑا قلق ہوتا ہے۔

Es ist eine alte Geschichte,
Doch bleibt sie immer neu;
Und wenn sie just passiert,
Dem bricht das Herz entzwei

Heinrich Heine,

(بہ سلسلۂ گزشتہ) یہ بڑی پرانی کہانی ہے۔ حالانکہ ہمیشہ یہ نئی رہتی ہے۔ اور
جب یہ پیش آجاتی ہے تو دِل کے دو ٹکڑے کر دیتی ہے۔ (ہائن رِش ہائنے)

(۱)

ستاروں کی انجمن

مُشتری

شہابِ ثاقب سے کچھ نہ کہنا بپا ہے ہنگامہ آسماں پر

دُمدار ستارہ

یہ کیا ضرورت کہ دوسروں کو سناؤں اپنوں کی داستاں میں

مُشتری

یہی جو حالت رہی تو ہوگا بُرا اثر گردشِ زماں پر
نظامِ شمسی میں گر ستارے اسی طرح سرکشی کریں گے
تو صانعِ آفتاب کے حُکم سے بھی گردن کشی کریں گے

دُمدار ستارہ

زمیں کو ہے زُحل سے رنجش، سُنا یہ قصّہ گیا جہاں میں

رقاصۂ فلک

زُحل کو گر عشق ہی تھا کرنا، تو مجھ سے کرتا۔ یہ کیا نظر ہے

کہ جس کا مطلوب داغِ عشق زمیں سے مجنوں دیے بجھ رہے
کئی قمر ہیں زُحل پہ شیدا کہ گرد رہے ہیں طوافِ پیہم

اقمارِ زُحل

ازل سے یہ گردشِ مُسلسل ، ابد تلک یہ طوافِ پیہم

رقاصۂ فلک

زُحل کی بابت یہ مہرِ تاباں نے سچ کہا تھا کہ بوالہوس ہے

مُشتری

زمین کے چاند سے حسد سا ہے آج رقاصۂ فلک کو
نگاہ تاروں کی تاڑ جائے گی اک نئے عشق کی جھلک کو

رقاصۂ فلک

نگاہ گو مشتریِ فلک کی غضب کی تیز اور نکتہ رس ہے،
مگر مجھے آفتابِ تاباں کے عشقِ پیہم کی آگ بس ہے۔

اقمارِ زُحل

ازل سے یہ گردشِ مُسلسل، ابد تلک یہ طوافِ پیہم

زُحل

زمین کا چاند مجھ کو ملتا، یہ سب ستارے زمیں کو ملتے
تو ماہِ تاباں کی روشنی سے مری نگاہوں میں نُور ہوتا،
اگر نہ اس تیرہ خاکداں سے مرا قیام اتنی دور ہوتا
تو ماہِ روشن کو اُس کی آغوشِ تیرہ منظر سے کھینچ لیتا

زمین کے اِس قمر کو اپنی نگاہِ برتر سے کھینچ لیتا

زمین

نگاہِ برتر سے کھینچ لیتے مجھے تو اس کا یقیں نہیں ہے

چاند

زمین گو تیرہ خاکداں ہے مگر قیامت کی دلنشیں ہے

رقاصۂ فلک

(حقارت سے)

نگاہ اِس کوکب حقیر و کریہہ منظر کی خوب پہنچی

زُحل

ذرا سُن اے ماہتاب تجھ کو قسم ترے نورِ دلنشیں کی

چاند

زُحل کی ہے سطح سرد بالکل، زُحل کی آغوش سرد ہوگی

زُحل

قسم مجھے مہرِ ضوفگن کی، قسم مجھے چرخ چنبریں کی
جو میری منزل تلک کبھی تیری چاندنی رہ نورد ہوگی
تو ذرّہ ذرّہ مرے جہاں کا کرے گا اُٹھ کر طواف تیرا
یہ میں نے مانا مری چمک میں نہیں ہے گو دلکشی زمیں کی
زمیں میں آتش فشاں بہت ہیں، نہیں مگر اُن میں سوزِ پنہاں
زمیں کو کیونکر مجالِ عشق و تلاشِ تکلیف و درد ہوگی؟

آفتاب

اے زحل یوں تو ستاروں میں ترا ہمسر نہیں
حسنِ ظاہر میں زمیں سے تو مگر برتر نہیں

چاند کو ہے عشقِ صورت سے محبت ہے تو ہیں
اس کو کیا پروا زمیں میں شعلہ و اخگر نہیں

ہو چکا ثابت زمیں ہی سے قمر کو عشق ہے
رنگ و روغن سے حسینوں کی نظر کو عشق ہے

ہے زمیں پر بحرِ طغیاں خیز میں بدمستیاں
شاید ان سے کوکبِ طوفاں اثر کو عشق ہے

اک پرندہ ہے وہاں مشہور عاشق چاند کا
شاید اس سے اخترِ بے بال و پر کو عشق ہے

ہے وہاں آباد انساں ایک مخلوقِ خبیث
کیا تعجب اس سے نجمِ بے خبر کو عشق ہے

(۲)

شہابِ ثاقب نے آ سنایا
زمیں پہ مجھ کو یہ سارا قصّہ

---- (۳) ----

میں

مجھے ایک اُلجھن سی ہے مُتصِل
کہ ہوں جِس کے ہاتھوں پراگندہ دِل
کہانی ستارے سے ایسی سُنی
نئی آگ سی دل میں جلنے لگی
ستاروں کی الفت کی تھی داستاں
غضب کی تھی وہ داستاں دِل ستاں

مرا دِل نہایت پریشان ہے
ترے ہاتھ اس دُکھ کا درمان ہے

میر تقی

"جگر جورِ گردوں سے خوں ہوگیا — مجھے رُکتے رُکتے جنوں ہوگیا
نظر آئی اک شکل مہتاب میں — کمی جس سے آئی خورو خواب میں"

میں

نظر آئی جو شکل مہتاب میں
بہت اُس کے چرچے ہیں احباب میں

؎ لے مثنوی خوابِ دِل

کہا لاکھ میں لے کہ ہے یہ وہ چاند
کہ ہر چاند دنیا کا ہے جس سے چاند
وہ صُورت ہے جس سے محبّت مجھے
ہمیشہ رہی جس سے اُلفت مجھے
اِسی ماہِ کامل سا اُس کا بھی نُور
اِسی ماہِ کامل سا اُس کا ظہُور

میرتقی

اُنے دیکھوں جیدہر کروں میں نگہ — وہی ایک صورت ہزاروں جگہ
کہیں نقشِ دیوار دیکھا اُسے — کہیں گرم رفتار دیکھا اُسے
کبھو گرم کینہ ، کبھو مہرباں — کبھو دوست نکلے، کبھو خصمِ جاں
جو میں ہاتھ ڈالوں تو واں کچھ نہیں — بجز شکلِ وہمی عیاں کچھ نہیں
جنوں آہ درپے ہوا جان کے — مجوّز ہوئے یار زندان کے
وہ صورت کہ تھا وہم دیوانگی — لگی کرنے در پر وہ بیگانگی
غرض نااُمیدانہ کر اک نگاہ — وہ نقش توہّم گیا سوئے ماہ
نہ آیا کبھو پھر نظر اُس طرح — نہ دیکھا اُسے جلوہ گر اُس طرح
مگر گاہ سایہ سا مہتاب میں — کبھو وہم سا عالم خواب میں"[۱]

---

۱ مثنوی خواب دِل

میں

یہ کیسے کہوں وہم مجھ کو بھی ہے
اگر وہم یہ زندگی بھر رہے
مگر مجھ کو جس ماہ سے عشق ہے
تعلق ہے اُس کا اِسی دہر سے

(۴)

یوں تو دیکھا تھا لڑکپن میں کئی بار اُسے
پردۂ غنچۂ نورس میں نہاں گُل جیسے
جس طرح عشرۂ اول میں مہِ نو کا جمال
محوِ کوشش ہو پئے بدرِ منور کا کمال
جس طرح ذہنِ مصور میں نہاں ہو تصویر
اور پھر صفحۂ قرطاس پہ ڈھونڈے تعبیر
جس طرح حجلۂ انگور میں بیلائے شراب
اُس کے بچپن میں نہاں تھا بُتِ طنّازِ شباب
اُس کو دیکھا تو نگہ تک مری مخمور سی ہے
نفسِ تیز کی حالت دلِ مجبور سی ہے
میں نے پوچھا تری صورت تو ہے پہچانی سی
کیوں تجھے دیکھ کے ہے قلب کو حیرانی سی!
کس مصور کی تصاویر میں دیکھا ہے تجھے؟
کس صحیفے کی تفاسیر میں دیکھا ہے تجھے
کسی صنّاع کی صنعت کا تماشا تھی تو!
کسی شاعر کے تخیّل کی تمنّا تھی تو؟

وہ تو کچھ چیں بہ جبیں ہی سی رہی اور خاموش
حسنِ کامل کو مگر اُس کے ذرا آیا جوش
ساری دُنیا میں تو کیا جانیئے کیا کہتے ہیں
لوگ مشرق میں مجھے ماہ لقا کہتے ہیں

(۵)

(پیرس)

شاں زلیزے[1] پر ہے کیسی روشنی چھائی ہوئی
رات بھی بجلی کے بوسوں سے ہے شرمائی ہوئی
نُور کے سایے میں دُنیا کے حسینوں کا ہجوم
اِس زمینِ آسماں انداز کے تاباں نجوم
دخترِ المانیہ کے عصفریں اور زرد بال
دلبرِ ہسپانیہ کی نازنیں چشمِ غزال
بنتِ امریکہ کا وہ شہزادیوں کا سا لباس
ہر نظر کی شوخیوں میں دلبری کا التماس
اِک فرانسیسی نے مُڑکر اپنے ساتھی سے کہا
دیکھو اندازِ تجمّل دلبرانِ ہند کا
آرہی تھیں اس طرف سے مہ جبینیں ہند کی
اپنے ہمسایوں میں ان کی دل کشی کچھ کم نہ تھی
اِن گلوں سے پھر جو خوشبوے دیار آنے لگی
اِس پرستاں میں بھی مجھ کو یادِ یار آنے لگی

---

[1] شاں زلیزے Champs Elyse,es پیرس کی سب سے زیادہ خوبصورت سڑک۔

— (۶) —

دساں ریمیو ۔ اطالوی ریویرا ۔ گرمیوں کے موسم میں ایک سہ پہر شام سمندر کے کنارے

سفو رینا نے کہا "سچ کہنا
اور کس کس سے یہی تم نے کہا؟"
رُک گیا میں تو کہا "پھر خاموش؟
ایک دو جام میں اتنے مدہوش؟"
ان کی آنکھوں کو جو دیکھا تو شرارت کی جھلک
اور ہونٹوں پہ وہی برقِ تبسم کی چمک
جسم میں تازگی و عطر و نفاست کی مہک
ہاتھ کو چوم کے میں نے یہ کہا
"ہے یہ الزام ذرا بیجا سا
مئے گلفام کو کیوں کرتی ہو ناحق بدنام
ہیں خطاکار تو ہیں آپ کی آنکھوں کے جام
آپ کے حسن سے سرشار ہوں میں
کیجیے انصاف خطاوار ہوں میں؟"

سنو ریتا نے کہا "سچ کہنا
اور کس کس سے یہی تم نے کہا؟
ایسے جملوں کی تو شاید تمھیں عادت ہی ہے
ہاں تمھیں ہر کس و ناکس سے محبّت ہی ہے
ہے سبھی مردوں کی عادت جو یہی
کاش اک تھوڑی سی جدت ہوتی"

پھیلتی جاتی تھی تاریکیٔ شام
دستِ نازک کو لیا میں نے تھام
مڑ کے دیکھا تو کوئی اور نہ تھا
اس کے رخسار کو جھک کر چوما
پھر کہا "مجھ کو ترے حُسنِ فروزاں کی قسم
تیری آنکھوں کی، ترے کاکلِ پیچاں کی قسم
اس خموشی میں سمندر کے ترنُّم کی قسم
تیرے ہونٹوں پہ ملامت کے تبسم کی قسم ......"
میں ابھی اور بھی قسمیں کھاتا
اُس تبسم نے مگر روک دیا
سنو ریتا نے کہا "سچ کہنا
اور کس کس سے یہی تم نے کہا؟"

میں نے دل میں یہ کہا یوں تو کئی سے یہ کہا
مہ لقا سے کبھی یہ کہنے کا موقع نہ ملا
کیا خبر تھی کہ کہوں گا بھی تو ٹھکرا دے گی
عشق سچّا ہو تو ملتی ہے سزا بھی اُس کی

(۷)

(ناروے کی شمالی بندرگاہ برگن میں سونیا اور اس کی سہیلیاں)

سونیا کی سہیلیاں

ہندستاں سے پاس تمھارے ایک مسافر آیا تھا
سانولی اُس کی رنگت تھی
ہم سب سے ہنس بول وہ لیتا لیکن اُس کو زیادہ تر
چُپ رہنے کی عادت تھی

سونیا

جب سے وہ برگن سے گیا ہے اُس کا اک خط آیا تھا
لہجہ کچھ مغموم سا تھا
مجھ کو اُس سے الفت تھی پر اُس کے دل میں عشق کا نقش
شاید کچھ موہوم سا تھا

سہیلیاں

ہم نے اُس سے پوچھا بھی تھا "جب سے تم اس ملک میں آئے
تم کو کس سے چاہ ہوئی؟"
ہنس کے کہا "کیوں پوچھا مجھ سے؟ تم سب پر تو ظاہر ہے
دِل کو دِل سے راہ ہوئی"

سونیا

پھر بھی اس کے عشق میں وہ بے تابی کا سا جوش نہ تھا
بوسوں میں تھی سردی سی
غور سے چہرہ اس کا دیکھا میں نے دھندلی راتوں میں
چہرے پر تھی زردی سی
پوچھا میں نے "ہندستاں میں تم کو کسی سے عشق ہُوا؟"
کچھ لمحے خاموش رہا
(میں نے دیکھا چہرے پر کچھ سُرخی تھی کچھ زردی تھی)
پھر یہ ہنس کر اُس نے کہا
"ہند کی پریوں میں ہے ملاحت پر یہ مرمر کا سا رنگ
ایسے سنہرے بال کہاں
نیلی آنکھیں، ہنستا چہرہ، برف سا سینہ، سرخ سے لب
گورے گورے گال کہاں"
میں نے کہا "دیکھا ہے تم نے آدھی شب کو سورج[1] یاں
ہند میں یہ منظر ہی نہیں"
اُس نے کہا "واں ماہِ دو ہفتہ[2] کرتا ہے مدہوش مجھے
برف پہ وہ اختر ہی نہیں"

---

[1] شمالی ناروے میں گرمیوں کے موسم میں رات کو بھی آفتاب نظر آتا ہے، اور سردیوں میں دن کو آفتاب نہیں نکلتا۔
[2] سرد ملکوں میں چاند کی روشنی اتنی لطیف اور تیز نہیں ہوتی جتنی ہندستان میں۔

(۸)

(جنت شدّاد)

طیور

آئی ہے ماہ لقا گلشنِ شداد میں آج

آؤ ہم اس کی محبت کے فسانے گائیں

آگ لگ جائے ہوا میں وہ ترانے گائیں

نو بہار آئی ہے اس گلشنِ برباد میں آج

تیتری

گلہائے رنگیں ہیں خاک بر سر

حیران و ساکت ہے چشمِ طائر

گلشن میں آیا کیسا گلِ تر

ماہ لقا

کہتے ہیں مجھ کو ماہ لقاء میں گلشن کی سلطانہ ہوں

بھنورا

دُنیا کا حُسن فزوں تجھ سے

ہر دِل میں سوزِ دروں تجھ سے

ماہ لقا

کہتے ہیں مجھ کو ماہ لقا، میں گلشن کی سلطانہ ہوں

بھونرا

تابش میں موجِ نور ہے تُو
شوکت میں برقِ طور ہے تُو

ماہ لقا

کہتے ہیں مجھ کو ماہ لقا، میں گلشن کی سلطانہ ہوں

طیور

آئی ہے ماہ لقا جنّتِ شدّاد میں آج
آؤ پھر مطلع تاباں سے تبسّم سیکھیں
آبشاروں سے پھر آئینِ ترنم سیکھیں
طلب داد ہے چشمِ ستمِ ایجاد میں آج

— ۹ —

دِلبروں میں بیٹھی تھی دِلبروں کی سلطانہ
چھڑ گیا وہاں شاید میرے غم کا افسانہ
ہنس کے وہ لگی کہنے "اس عاشق کی اُلفت میں
مشکل ہے توازن یا مستی کا پتہ پانا
جسم کی لطافت میں دِل کا فلسفہ پنہاں
عشق ہی کو ظالم نے دل کی انتہا جانا
صورت پر پریشانی، اور آنکھوں میں حیرانی
باز آئے اُلفت سے، جا کے اُس کو سمجھانا"

(۱۰)

اپنے وطن میں دِل کو عبث مبتلا کیا
کمبخت تو نے اپنی جوانی کو کیا کیا[1]

آنکھوں میں تیرے اب وہ جسارت نہیں رہی
دِل کے سوا بدن میں حرارت نہیں رہی
کمبخت تو نے اپنی جوانی کو کیا کیا

پیدا کئی بُتوں سے سُنا رسم و راہ کی
چاہا بھی تو گیا، جو کبھی ان سے چاہ کی
اُن سب کو چھوڑ، اپنی جوانی تباہ کی
کمبخت تو نے اپنی جوانی کو کیا کیا

اُن سب بُتوں کو چھوڑ کے پھر مہ لقا کا عشق
اُس خود پرست و خود نگر خود نما کا عشق
شعرائے عشق کے صنم پُرجفا کا عشق
کس بیکسی کا، درد کا، کس ابتلا کا عشق
کمبخت تو نے اپنی جوانی کو کیا کیا

---

[1] Verlaine : " Quas tu fait........de ta jeunesse "

——— (۱۱) ———

میں

ابتلائے عشق سے باطل ہے افسونِ خودی
اک معمہ بن گئی تعلیمِ مضمونِ خودی
حسنِ نسوانی سے اُس شعلے کا ہوتا ہے ظہور
جس کے پرتو سے قنادیلِ مساجد میں ہے نور

اقبال

"دُور کر یک ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو"

میں

اپنی فطرت کے تجلی زار میں ظلمت سی ہے
میری مجبوری کو میرے عشق سے نفرت سی ہے

اقبال

"زاغ کہتا ہے نہایت بدنما ہیں تیرے پر
شپرک کہتی ہے تجھ کو کور چشم و بے ہنر
لیکن اے شہباز یہ مرغانِ صحرا کے اچھوت
ہیں فضائے نیلگوں کے پیچ و خم سے بے خبر"

میں

"عشق بے حاصل خودی کی موت کا ساماں ہے
خودکشی ہی اس شکستِ و درد کا درماں ہے"

اقبال

"عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دمبدم"

خاتمہ بر غزل

اے دِل یہ دنیا جھوٹی ہے یاں مہر و وفا کا نام نہیں
کہتے ہیں دِل کو آئینہ دیکھو تو صفا کا نام نہیں
دِل یوں تو عروسِ ہستی کی پیکانِ نظر کا گھائل ہے
آنکھیں کھولیں اور دیکھا تو آنکھوں میں حیا کا نام نہیں
بجلی چمکی خرمن پہ گری پر ہوش نہ آیا دہقاں کو
سمجھا تھا کہ پانی برسا ہے دیکھا تو گھٹا کا نام نہیں
ہے سنگ زنی کا شوق اگر انکارِ جفا سے کیا حاصل
یاں شیشۂ دِل تک ٹوٹ گیا، کہتے ہیں صدا کا نام نہیں
وہ باغ جسے دِل کہتے تھے کچھ ایسی خزاں آئی اُس پر
پھولوں پر موت کی زردی ہے، بلبل کی نوا کا نام نہیں
جھپکی جو پلک تو چہروں سے غازے کا نشاں مٹتا پایا
شانوں نے زُلف کو چھوڑ دیا، ہاتھوں میں حنا کا نام نہیں

اقبال کی آواز

"نہیں ہنگامۂ پیکار کے قابل وہ جواں
جو ہوا نالۂ مرغانِ چمن سے مدہوش"

عمر خیّام

(ایک منظوم ڈرامہ)

سنہ ۱۹۳۲ء

پہلا منظر

— مدرسہ —

وقتست کہ از جام جہاں آرایند
وز چشم سحاب چشمہا بکشایند
موسیٰ دستاں ز شاخ کف بنمایند
عیسیٰ نفساں ز خاک بیروں آیند

(مدرسے کے سامنے سبز قطعہ زمین۔ حسن بن صباح، عمر خیام اور وہ طالب علم جس کو نظام الملک کا خطاب ملنے والا ہے)

("آواز فطرت" کی آمد)

آواز فطرت

(پس منظر سے)

وہ چیز جس کو طلسم حیات کہتے ہیں
جسے حجاب رخ کائنات کہتے ہیں
وہ شب کہ جس کو زمانے نے روز گردانا
وہ دن کہ جس کو زمانے میں رات کہتے ہیں

کسی پہ کھل نہ سکا اس کا راز دنیا میں | وہ شے جسے صفت بے صفات کہتے ہیں

شکست کھا کے ہوئی عقل سرنگوں آخر

طلسم ساز کا چل ہی گیا فسوں آخر

آواز فطرت

(نظام الملک سے مخاطب ہو کر)

بتا تو بھی تجھے اک دن نظام الملک ہونا ہے

تجھے کشت جہاں میں نظم انصاف آکے بونا ہے

بتا تو ہی کہ اس ہستی کا آخر مدعا کیا ہے

سنا اس زندگانیٔ جہاں کا ماجرا کیا ہے

نظام الملک

زندگانی اک فضائے لامکاں کا نام ہے

عکس روئے صانع کون و مکاں کا نام ہے

زندگی وہ خواب ہے تعبیر ہو جس کی فنا

ہستیٔ انساں طلسم بے نشاں کا نام ہے

پھر بھی یہ ہستی حیاتِ جاوداں کا عکس ہے

زندگی انسانیت کے امتحاں کا نام ہے

زندگی کی شمع روشن ہے ازل کے نور سے

خاک انساں سجدہ گاہ قدسیاں کا نام ہے

آواز فطرت

(حسن بن صباح سے)

حسن ابن صباح اب تو بتا
کہ انجام اس زندگی کا ہے کیا؟
عزازیل سے تو نے سیکھا ہے کیا؟
کہ اس زندگی کا ہے کیا مدعا

حسن بن صباح

زندگی ایک شورش آتش فشاں کا نام ہے
ذرہ ہائے مضطرب کے اک جہاں کا نام ہے
زندگی اک برق ہے خرمن جلانے کے لئے
زندگی کی موج خارِ آشیاں کا نام ہے
دہر میں سوزش نہ ہو تو زندگی بے لطف ہے
زندگانی تیشہ و سنگ گراں کا نام ہے
ہے ازل سے عالمِ فانی پہ ابلیسی اثر
خاک انساں مشتِ خاکِ رائیگاں کا نام ہے
بزدلی کا نام اس دنیا نے نیکی رکھ دیا
رازِ عصیاں زندگی کی داستاں کا نام ہے

آواز فطرت

(عمر خیام سے)

اے عمر خیام کیوں تیری جبیں ہے پُر شکن
کس لئے خاموش ہے تو؟ کس لئے رنج و محن

زندگی کے راز پنہاں کی بھی کچھ تفسیر کر
تجھ کو ہونا ہے جہاں میں شاہ اقلیم سخن

عمر خیام

زندگی خواب پریشان جہاں کا نام ہے — حاصل ہستی وبال جانستاں کا نام ہے
ہر قدم پر جس کو اک طوفاں کا اندیشہ رہے — زندگی اس کشتئ بے بادباں کا نام ہے
جو خزاں کے خوف سے ہر لحظہ پژمردہ رہے — زندگی اس سرو سبز بوستاں کا نام ہے
جس کے آنے کا پتہ ہے اور نہ منزل کا نشاں — زندگی اس کاروان خستہ جاں کا نام ہے
جس کی تہ تک عقل و ہوش و دل نہ پہنچیں گے کبھی — زندگانی اس طلسم جاوداں کا نام ہے

آواز فطرت

تعبیر خواب زیست تو یوں کر چکے مگر
تھا تین طاقتوں کا جدا جا بجا اثر
(نظام الملک سے) تم کو ملی حیات تو آغوش زہد میں
(حسن بن صباح سے) ابلیسیت میں آئی تمھیں زندگی نظر
(عمر خیام سے) { تم کو ملی حیات شکست حیات میں
ٹوٹا جو جام مستئ مے نے کیا اثر }
لیکن یہ دیکھنا ہے کہ یہ تین قوتیں
بنتی ہیں دور زیست میں کس طرح راہ بر

ہو گا جہاں نظامت طوسی سے مستفید
صباح کے اصول سے پھیلے گا شور و شر
خیام پی کے بادہ کرے گا جہاں کو مست
اور درد دل سے چشم جہاں ہو گی خوں سے تر
ان تین طاقتوں میں رہے گی وہ کش مکش
جس سے رُخِ زمانہ پہ ہووے گا اک اثر

[آواز فطرت کے جانے کے بعد]

حسن بن صباح

جہاں تسکین پاتا ہے فریب نور ایماں سے
مگر میں درسِ ہستی لے رہا ہوں شور عصیاں سے
گلستانِ جہاں بیکار خار و گل کا میداں ہے
کروں گا دامن گل چاک میں خار گلستاں سے
سکونِ عیش سمجھا دہر نے ہیجانِ ہستی کو
جگا میں دوں گا طوفاں بن کے اس خواب پریشاں سے
جسے ابلیسیت کہتی ہے دنیا اک کرشمہ ہے
لیا ظلمت میں درسِ زیست جس نے نور یزداں سے

نظام الملک

ہے عمر دو روزہ میں دعا بس یہ خدا سے
مقصد ہو مرا خدمت دیں فقر و غنا سے
مقصد ہو مری زیست کا ہمدردی انساں
ہو مجھ کو غرض گر، تو ہو خالق کی رضا سے

عمر خیام

نکل کر اس جہانِ رنگ و بُو سے جاوداں ہو جا
اُبھر کر خاک کی پستی سے محوِ لامکاں ہو جا
فریب عکس میں الجھا ہوا ہے عالمِ فانی
جمالِ راز ہستی کا جہاں ہیں ترجماں ہو جا

[پردہ]

دوسرا منظر

—— دربار ——

آں بہ کہ دریں زمانہ کم گیری دوست
با اہل زمانہ صحبت از دور نکوست
آں کس کہ بہ جملگی ترا تکیہ بروست
چوں چشم خود باز کنی دشمنت اوست

{ رقص و سرود }

ایک درباری

(الپ ارسلان کی تعریف میں)

دنیا جو آج خرم و فرخندہ کام ہے — ہر سو جہاں میں شادی و بہجت کا نام ہے
باقی رہے جہاں میں الپ ارسلاں کا دور — جس میں نظام ملک کا یاں انتظام ہے
الطاف اور فضل سے عالم ہے مستفید — تحصیل علم و فن کا غضب اہتمام ہے
ہے دشمنوں کے شر کے لیئے تیغ بے پناہ — اور دوستوں کو فضل و عنایت سے کام ہے
سیلاب کامیابی نصرت کے سامنے — اعدائے بدنہاد کا قصہ تمام ہے
ہے دل سے محو قیصر و کسریٰ کی عظمتیں — سلجوقیوں کے دور کا وہ احتشام ہے

الپ ارسلان

(نظام الملک سے)

نظام الملک تیرے فیض پر دنیا یہ کہتی ہے
کرے خورشید کو جو ماند اختر ہو تو ایسا ہو
بہے خوں ہو کے جو ہر درد دل کی داستاں سن کر
جہاں میں آہ کوئی دیدۂ تر ہو تو ایسا ہو

(حسن بن صباح آتا ہے)

حسن بن صباح

دورِ ہستی میں شہید جلوۂ باطل ہوں میں
زندگی کا اک نشانِ سعی بے حاصل ہوں میں
شعلۂ باطل بھی اس دنیا کی ظلمت میں بجھا
دہر میں دورِ چراغ کشتۂ محفل ہوں میں
قوتِ شر بھی مصافِ زیست میں ناکام ہے
ہو کے خوں جو بہہ چکا ہو آہ اب وہ دل ہوں میں

نظام الملک

(سفارشاً)

بزمِ ہستی سے پشیمانیٔ عصیاں لے کر
ایک دل خستہ چلا دیدۂ حیراں لے کر
ہے ترے فضل و کرم سے مجھے امید کہ اب
یاں سے جائیگا نہ وہ قلب پریشاں لے کر
کوئی آفت زدہ آیا در دولت پہ ترے
جب گیا یاں سے گیا بختِ درخشاں لے کر

الپ ارسلان

بس نظام الملک کی خاطر ہمیں منظور ہے
سلطنت کی شمع روشن اس کے دل کا نور ہے
آج سے رکن حکومت ہم بناتے ہیں تجھے
سرپرستی ہم کو تیری ہر گھڑی منظور ہے

[نظام الملک جاتا ہے]

[موسیقی]

حسن بن صباح

یوں تو آساں زندگی ہے اک دلِ محزوں کے ساتھ
لطف تب ہے جب بسر ہو شاہدِ گلگوں کے ساتھ
یوں نظام الملک کے زہدِ ریا آمیز نے
سازِ عشرت کر دیا برباد اک افسوں کے ساتھ
جس طرح آئے خزاں صحنِ چمن کو لوٹنے
اور رخصت ہو جوانانِ چمن کے خوں کے ساتھ

الپ ارسلاں

(ملامت اور غصے سے)

کیا مروت کا یہی انجام ہے؟
دوستی کیا بس اسی کا نام ہے؟
تیری ہر جنبش میں پنہاں اک فریب
رہزنِ ایماں ترا ہر کام ہے؟

[نظام الملک آتا ہے]

حسن بن صباح

(دربار سے جاتے ہوئے)

تمہارے سازِ عشرت کو پریشاں کر کے چھوڑوں گا
تمہارے خوں سے زخمِ دل کا درماں کر کے چھوڑوں گا

اجازت، باغباں، گلچینیوں کی گر نہیں دیتا
تو اس گلشن کو ہم رنگِ بیاباں کر کے چھوڑوں گا

یہی ٹھیری جو شرطِ زندگی سیلابِ ہستی میں
تو ہر قطرے میں پیدا زورِ طوفاں کر کے چھوڑوں گا

گنہ کی بجلیوں کی ضوفشانی سے مدد لوں گا
ترا خرمن نثارِ برقِ تاباں کر کے چھوڑوں گا

[جاتا ہے]
[عمر خیام آتا ہے]

نظام الملک

حضورِ شاہ میں ایک کاملِ فن آج آیا ہے
چمن سے رازدارِ سیرِ گلشن آج آیا ہے
عمر خیام جس کے فیض سے دنیا منور ہے
چمن زارِ جہاں سے گل بہ دامن آج آیا ہے

الپ ارسلان

اے عمر خیام اے ملک سخن کے شہریار
خوش نصیبی سے ہوا اس ملک میں تیرا گزار
ہاں بتا دے گر تجھے جاہ وحشم درکار ہو
تیرے قدموں پر زمانے بھر کی دولت ہو نثار

عمر خیام

گو شاہد گردوں کی ادا اور ہی کچھ ہے
پر قلب مصفا کی ضیا اور ہی کچھ ہے
ہے علم کی خدمت سے غرض مجھ کو جہاں میں
مانا کہ زمانے کی ہوا اور ہی کچھ ہے
سرشار ہے دنیا مئے گلگوں کی ضیا سے
پر تشنگیٔ آب بقا اور ہی کچھ ہے

(پردہ)

منظر در منظر

حسن بن صباح کے فدائیوں کے ہاتھ نظام الملک کا قتل

تیسرا منظر

(شاہراہ)

ہر جا کہ گلے و لالہ زارے بودست
از سرخئ خون شہریارے بودست
ہر شاخ بنفشہ کز زمیں می روید
خالے ست کہ بر رخ نگارے بودست

(شاہراہ)
(نظام الملک کے ماتم میں راہ گیروں کا ماتمی لباس)
(عمر خیام آتا ہے)

عمر خیام

ہنگامہ کیوں بپا ہے کہ ماتم کناں ہیں سب؟
کیا ہو رہا ہے شہر میں کیوں نوحہ خواں ہیں سب؟

راہ گیر

نظام الملک طوسی کی شہادت کا یہ ماتم ہے
اسی کی موت کے غم میں سیہ پوش ایک عالم ہے

کیا دنیا کو مالامال جس کے فیض نے برسوں
اُسی فیاض و عادل کے گزر جانے کا یہ غم ہے
حسن صباح جس کے کارہائے شر کی شورش سے
بدی کی طاقت اس دنیائے فانی میں مسلم ہے
شہید اُس نے کیا اس پاک ہستی کو مکائد سے
کہ جس کے رنج و غم میں خونفشاں اب چشم عالم ہے

عمر خیام

ماتم کے ساتھ آمد فصلِ خزاں ہے آج
ہر برگِ گل سے خونِ شہیداں عیاں ہے آج
ہر موج بحرِ زیست کی ہے قاصد فنا
طوفاں سے غرق کشتیٔ عمرِ رواں ہے آج
پیکِ اجل نے رازِ فنا کیوں بتا دیا
ہر سر رہینِ منّتِ سنگِ گراں ہے آج
تعمیر زندگی ہے اجل ہی کے واسطے
تارِ نفس میں سوزشِ برقِ تپاں ہے آج
(وقفہ)

عمر خیام

کیا خونِ تمنا ہے زمانے نے وضو برسوں
رہی برقِ تپاں کو خرمنوں کی جستجو برسوں
ہوئی جب خار و گل میں کشمکش صحنِ گلستاں میں
ہوا لٹ کر پریشاں کاروانِ رنگ و بو برسوں
شہید ناوک بیداد ہر صید حرم ہے یاں
مٹایا دورِ گردوں نے طلسم آرزو برسوں
کبھی دنیا سکوں سے آشنا ہونے نہیں پائی
رہا شرمندۂ چاکِ گریباں ہر رفو برسوں
بس اب اے شاہدِ گردوں حسد کی انتہا بھی ہے
کہ ہر رخسار سے مٹتا رہا یاں رنگِ رُو برسوں

دوسرا راہ گیر

حسن بن صباح بھی دنیا سے رخصت ہو گیا آخر
ہزاروں قتل کر کے جان اپنی کھو گیا آخر

عمر خیام

اجل گلشن میں پہلے آئی جورِ باغباں ہوکر
گری پھر خرمنِ صیاد پر برقِ تپاں ہوکر
کوئی ظالم کوئی مظلوم دنیا سے ہوا رخصت
فنا کا راز باقی ہے صدائے الاماں ہوکر
فنا کے واسطے پیدا کیا دنیا میں انساں کو
ڈبویا نامِ ہستی زندگی نے رائیگاں ہوکر

[پردہ]

چوتھا منظر

میکدہ

آمد سحرے ندا ز میخانۂ ما
کے رند خراباتی و دیوانۂ ما
بر خیز کہ پر کنیم پیمانۂ زمے
زاں پیش کہ پر کنند پیمانۂ ما

[میخانہ]

عمر خیام

مغبچوں کی سنگت

[کوزوں کے انبار]

مغبچوں کی سنگت

بے رنج و تعب
اے لیلی شب
ہنگام طرب
آتا ہے اب

روشن کوکب بھی فروزاں ہے اب مثل شعاع رحمت رب
اِس رنج کا اس حرماں کا سبب؟ یہ شور و فغاں بیکار ہیں سب

عمر خیام

یہاں تک ہستیٔ انساں کو غم نے تاک رکھا ہے
کہ ہر موجِ نفس میں خنجرِ سفاک رکھا ہے
خمیرِ جام بنتا ہے گِل خاکِ حسیناں سے
مئے گلگوں ہے یا خونِ دلِ صد چاک رکھا ہے
مگر اب بادۂ صافی کو پی لے کچھ تو تسکیں ہو
یہ سامانِ شکستِ شیشۂ ادراک رکھا ہے

سنگت

پھر آج چمن میں جلوہ فگن ہے شاہدِ گل کا رخ روشن
پھر لالہ و ریحان و سوسن ہے رشکِ ختن ہے آج چمن
عشرت کے ترانے گانے کو
اور لذتِ غم کے مٹانے کو
پھر آج چمن میں جلوہ فگن ہے شاہدِ گل کا رُخ روشن

عمر خیام

برخیز و دوائے ایں دلِ تنگ بیار
آں بادۂ مشکبوئے گلرنگ بیار

اجزا ے مفرح غم ار می خواہی
یاقوت مے و بریشم چنگ بیار

سنگت

لو جام شراب کہ پھر گلشن — اب باد بہار کا ہے مسکن
اے مطرب پھر وہ طرز کہن — سب بھولیں جس سے رنج و محن
ہو جائیں جو ساقی کے ورشن — تو آؤ لٹا دو تن من دھن

عشرت کے ترانے گانے کو
اور لذت غم کے مٹانے کو

پھر آج چمن میں جلوہ فگن — ہے شاہد گل کا رخ روشن

(جام و چنگ کے ساتھ ساقی کی آمد)

عمر خیام

خیامؔ اگر زبادہ مستی خوش باش
بالالہ رخے اگر نشستی خوش باش
چوں آخر کار نیست خواہی بودن
آں گاہ کہ نیستی چو ہستی خوش باش

مغنیے

وہ ضیائے طلعتِ مہ جبیں کہ مہ دو ہفتہ ہو شرمگیں
وہ ہوائے کاکلِ عنبریں کہ خجل ہو جس سے غزالِ چیں
وہ طلسم نرگسِ سرمہ گیں کہ جہاں ہے جس سے تہِ نگیں
وہ جمالِ عارضِ آتشیں کہ چمن میں رشک ہے گل حزیں
(سنگت ا)۔ تری ہر جھلک بتِ نازنیں ہے شکیبِ عشق پہ نکتہ چیں

وہ فسونِ عشوہ جانستاں کہ ہر ایک قلب ہے خونِ چکاں
وہ تبسم لبِ ارغواں کہ فریبِ محفلِ گلرخاں
مژۂ دراز ہے دل ستاں کہ ہر ایک لب پہ ہے الاماں
وہ نگہ میں وسعتِ لامکاں کہ نگوں ہے گنبدِ آسماں
(سنگت ا)۔ تری ہر جھلک بتِ نازنیں ہے شکیبِ عشق پہ نکتہ چیں

ساقی کا گیت

خزاں ہونے کو ہے فصلِ شباب آہستہ آہستہ
بس اب جاری رہے دورِ شراب آہستہ آہستہ
مئے رنگیں اگر ہو کامیاب آہستہ آہستہ
سکوں پائے دلِ پر اضطراب آہستہ آہستہ

اِدھر ہو دختر رز بے حجاب آہستہ آہستہ
اُدھر مستِ طرب چنگ و رباب آہستہ آہستہ
رُخِ رنگینِ مے ہو بے نقاب آہستہ آہستہ
کہ ہو جیسے طلوع آفتاب آہستہ آہستہ

عمر خیام

بر روئے گل از ابر نقاب است ہنوز
در طبع و دلم میل شراب است ہنوز
در خواب مرو چہ جائے خواب است ہنوز
جانا مے دِہ کہ آفتاب است ہنوز

(پردہ)

پانچواں باب

—— «لب آبجو» ——

من ہیچ ندانم کہ مرا آں کہ سرشت
از اہل بہشت گفت یا دوزخ زشت
جُوتے و بُتنے وہ بادۂ بر لب کشت
ایں ہر سہ مرا نقد و ترا نسیہ بہشت

(لب آبجو)

(عمر خیام، ساقی، اور مغبچوں کی سنگت)

عمر خیام

سبزہ ہو چمن ہو اور مے گلگوں ہو
چھایا یا ہر سو بہار کا افسوں ہو
موجود اگر ساقیٔ گلفام رہے
دنیا کی مصیبتوں سے دل کیوں خوں ہو

دو دن کی اگر ہے زندگانی ساقی
رخصت ہونے کو ہے جوانی ساقی
تو ہو، مے ہو، بہار ہو، پھر کیا ہے
اک لمحہ ہے عمر جاودانی ساقی

(شاہد بہار کی مجسم صورت میں آمد)

—— . ——

شاہد بہار کا گیت

(کورس) چمن پہ اک نکھار ہے
کہ آمد بہار ہے

بہار ہے جو دل ستاں
تو ہے ہر ایک شادماں
طیور بھی ہیں نغمہ خواں
زمیں بنی وہ بوستاں
کہ آسماں نثار ہے

(کورس) چمن پہ اک نکھار ہے
کہ آمد بہار ہے

نکھار پر جو ہے چمن
گلوں پہ آج ہے پھبن
کلی ہر ایک خندہ زن
مہک رہی ہے یاسمن
ترنم ہزار ہے

(کورس) چمن پہ اک نکھار ہے
کہ آمد بہار ہے

کبھی بتانِ آذری
ہیں محو ناز دلبری
غضب ہے جنگ زرگری
وہ عشوہ و فسوں گری
ہر ایک بے قرار ہے

(کورس) چمن پہ اک نکھار ہے کہ آمد بہار ہے
جہاں میں ایک جوش ہے
کہ شورِ ناؤ نوش ہے
یہ چشم مے فروش ہے
کہ گُم شکیب و ہوش ہے
زمانہ مے گسار ہے
چمن پہ اک نکھار ہے کہ آمد بہار ہے
["لیلیٰ شب" کی آمد]

لیلیٰ شب

زمانہ مست ہے لیلائے شب کی چشم میگوں سے
نسیم جاں فزا آتی ہے کوہ و دشت و ہاموں سے
گلوں میں اک مسرت کی لہر سی دوڑ جاتی ہے
چہک اٹھتے ہیں غنچے بھی صبا کے رمزِ کُن فیکوں سے
قمر نکلا لباسِ نور میں گلگشت کی خاطر
فرشتے جھانکتے ہیں فصلِ گل کو بام گردوں سے
شبِ مہتاب میں محبوب ہو، ساغر ہو، مینا ہو
خجل ہو گلشنِ فردوس تک اس کیفِ افسوں سے
["دُختِ رز" کی آمد]

دختِ رز

دختِ رز آئی ہے چشمِ دلستاں کھولے ہوے
رازِ مستی کی نہفتہ داستاں کھولے ہوے
ظلمت گردوں میں حسن و عشق ہو جاتے فنا
جام کی گردش ہے چشمِ دلبراں کھولے ہوئے
آتشِ سیال میں عکس جمال یار ہے
ہے سیہ مستی رموز جاوداں کھولے ہوے
شورِ مینا نے چمن والوں کو حیراں کر دیا
رہ گئے گل لب بہ انداز فغاں کھولے ہوئے
مستِ نازِ حسن تجھ کو چشمِ میگوں کی قسم
اب تو آ جا گیسوے عنبر فشاں کھولے ہوئے

[تینوں شکلیں غایب ہو جاتی ہیں]

[عمر خیام کا ساغر ٹوٹ جاتا ہے]

عمر خیام

ابریق مے مرا شکستی ربی   بر من در عیش را بہ بستی ربی
بر خاک بریختی مے ناب مرا   من مست نیم مگر تو مستی ربی

[وقفہ]

اک ادائے ناز سے ساغر کے ٹکڑے کر دیئے
پھر ستمگر نے دل مضطر کے ٹکڑے کر دیئے
بے خودی کا راستہ جس نے بتایا دھر کو
رہزنِ گردوں نے اس رہبر کے ٹکڑے کر دیے
شعلۂ دل کو بجھا کر صبر آجاتا تجھے
کیا ستم ہے مشت خاکستر کے ٹکڑے کر دیے
ہے سکوں اِس عرصۂ ہنگامہ پرور میں محال
ظلمت شب نے مہ و اختر کے ٹکڑے کر دیے
(وقفہ)

دل مضطر فنا کا راز داں معلوم ہوتا ہے
کہ رازِ نیستی اب جاوداں معلوم ہوتا ہے
حبابِ بے خودی کو اس جہاں میں عیش کہتے ہیں
اسیروں کو قفس ہی آشیاں معلوم ہوتا ہے
فریب دید سے دنیا میں ہر دام سیہ بختی
خیال گیسوئے عنبر فشاں معلوم ہوتا ہے
مگر پھر نیستی اس خواب ہستی سے جگاتی ہے
تبسم بھی اک اندازِ فغاں معلوم ہوتا ہے
فنا کہ جام میں آبِ بقا لیکن ہے پوشیدہ
فنا کا رازِ ہستی کا نشاں معلوم ہوتا ہے

نگاہِ غور سے تعمیر ہستی کو اگر دیکھیں
زمیں کا ذرہ ذرہ آسماں معلوم ہوتا ہے
(طویل وقفہ)

ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو — آں کس کہ گنہ نہ کرد چوں زیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی — پس فرق میانِ من و تو چیست بگو

(حسن بن صباح کی روح داخل ہوتی ہے)

عمر خیام

حسن ابن صباح کی روح کیوں
یہاں آئی ہے اس طرح سرنگوں
حسن بن صباح کی روح
مرا تو نام بھی دنیا بھلا چکی لیکن
زمین شعر کا وہ شہریار باقی ہے
نشانِ زہر نہ باقی رہا زمانے میں
مگر شراب سخن کا خمار باقی ہے

(حسن بن صباح کی روح غائب ہو جاتی ہے)
(نظام الملک طوسی کی روح داخل ہوتی ہے)

نظام الملک کی روح

جسے زمانے نے رند جانا طلسم ہستی کا راز داں ہے
اسی کی عظمت کا آج چرچا زمیں سے تا حدِّ آسماں ہے
سمجھ سکا گر نہ اس کو زاہد قصور تھا تنگیٔ نظر کا
ملی حقیقت وہ بے خودی میں نثار خود گلشنِ جناں ہے
(غائب ہو جاتی ہے)
(رقص و سرود)

عمر خیام

من ظاہرِ نیستی و ہستی دانم
من باطنِ ہر فراز و پستی دانم
با ایں ہمہ از دانش خود شرمم باد
گر مرتبۂ ورائے مستی دانم
(پردہ)

"آہ یہ قومِ نجیب و چرب دست و تر دماغ
ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر"
اقبالؔ

فردوس بر روئے زمیں

ایک نظم

سنہ ۱۹۴۲ء

(۱)

گزریں جو کئی لاکھ برس اور نہ فنا ہو
انسان کی یہ نسل
اُستاد سے شاگرد کوئی اُٹھ کے یہ پوچھے:
"کیا چیز تھی کشمیر؟"

"وہ بحر پر آشوب
امریکہ سے تا قاف جو کرتا ہے حکومت
موجیں متلاطم
گرداب مسلسل!
اُس بحر کے نیچے ہیں چھُپے مُلک بہت سے
گزرے ہیں کئی لاکھ برس جب یہ سمندر
سِمٹا بدن اپنا کچھ اس آفت سے چُرایا
بہتا تھا جہاں اُس جگہ خشکی ہوئی ظاہر
ہاں آج جہاں بحر رواں کی ہے ریاست
امریکہ سے تا قاف جو کرتا ہے حکومت
پنجاب وہیں تھا
بنگال وہیں تھا

گنگا وہیں بہتی تھی
وہیں سندھ رواں تھی۔
واں سر بہ فلک کوہ سرافراز کھڑے تھے
انساں کے قدم ان کی بلندی پہ نہ پہنچے
پر موجِ رواں آج
ہے ان پہ دواں آج
ہے ان سے بلند آج
آغوش پہاڑوں کی تھی شق جس میں تھی اک جھیل
جب خشک ہوئی جھیل تو وہ بن گئی کشمیر
پر اب سے کئی لاکھ برس پہلے کا انساں
تھا سیح سے گریزاں
کہتا تھا کہ کشمیر ہے فردوس کی ہم سر
کہتا تھا کوئی ملک نہیں اس کے برابر۔
وہ دور عجب تھا
سورج میں حرارت تھی
دماغوں میں تعب تھا۔

(۲)

گو ہمالہ ہے فصیلِ کشورِ ہندوستان — چومتا ہے اُس کی پیشانی کو جھک کر آسماں
اس سے پیدا ہیں مگر دیرینہ روزی کے نشاں — پیر ہے وہ گردشِ شام و سحر کے درمیاں

کہتے ہیں تھے کچھ پہاڑ ایسے کبھی پنجاب میں
مٹ گئے پیکارِ برف و باد و خاک و آب میں

تاج بن کر برف جس کے فرق پر ہے جلوہ گر — رفتہ رفتہ یوں بڑھاتی ہے برودت کا اثر
جس سے بالوں کی سپیدی سر پہ آتی ہے نظر — پھر جو اتری تو چٹانوں کو گراتی فرش پر

اس بلندی سے گرا پتھر تو مٹی بن گیا
اک ذرا بارش ہوئی سیلاب مٹی کا بہا

(۳)

حضرتِ انساں ہزاروں سال کا یہ کھیل ہے
اک زمانہ وہ بھی تھا جب آپ یاں آئے نہ تھے
حسنِ فطرت کو جو داد آپ آ کے یاں دینے لگے
ہرج اس میں کچھ نہ تھا ۔ لیکن یہاں بسنے لگے
ہرج اس میں بھی نہ تھا ۔ لیکن جو لائے ساتھ تھے
بندروں کی سی ادائیں ، گیدڑوں کے ولولے
لومڑی کا مکر، کینہ اونٹ کا، وہ طنطنے
شیر کی جو نقل ہیں، سیکھے مگر گربہ سے تھے،
تم سے بدنامی زباں وہ عقل کی ہونے لگی
تم پہ قسمت خون کے آنسو یہاں رونے لگی
اب رہی فطرت، وہ بے پروا تھی بے پروا رہی
تم پہ کچھ گذرے اُسے تکلیف کیوں ہونے لگی

—— (۴) ——

مارِ غلیظ و خوبرو پیچ بہ پیچ و خم بہ خم[1]
شہر میں کب سے ہے رواں، موج بہ موج حسن و سم
اُس کی غلاظتیں کثیف اس کی روش بڑی عجیب
لطف کرے تو لطف ہے اور ستم، غضب ستم
اس سے کثیف تر ہے شہر، شہر سے وہ کثیف تر
شہر کی اس میں گندگی، اس کی نمی سے شہر نم
گود میں کتنے بام و در نوح و امیر و پیشہ ور
سطحِ عدم پہ ہے حیات، اور حیات میں عدم
موج سے اس کی ہم کنار پارچہ ہائے زرنگار
چوب پہ نقش کی بہار رنگ سے جام، جامِ جم
سرو و سفیدہ و چنار، اہلِ ہنر کی مفلسی
تو کہ رواں ہے رات دن، ان سے کہاں کرے گی رم
شہر کی زندگی ہے تو۔ یا تو حیاتِ تازہ دے
یا اسے پھر نجات دے۔ جھیل بن اور کر ختم

——•——

[1] جہلم، سری نگر میں

(۵)

اک فرنگی نے کہا

صُبح در باغ نسیم و شام در باغِ نگیں
بوسۂ لب ہائے خنداں، بوئے زُلفِ عصفریں
رقص میں آغوش در آغوش جسمِ نازنیں
دِل رُبا و دِل نواز و دِل فریب و دِل نشیں
اک فرنگی نے کہا

اک مسلماں نے کہا

دیکھ پھر شام نشاط اور صبح شالامار دیکھ
معنیِ جناتِ تجری تحتہ الانہار دیکھ
عظمتِ پارینہ کے مٹتے ہوئے آثار دیکھ
اِس خزاں میں بھی مگر شاداب برگ و بار دیکھ

اک مسلماں نے کہا

اشتراکی نے کہا

دیکھ سطحِ آب پر وہ کچھ شکارے ہیں رواں
جن میں آغوشوں میں لپٹے ماہ پارے ہیں رواں
اہلِ ثروت موٹروں میں آس کنارے ہیں رواں
ایک ٹوٹی ناؤ میں غربت کے مارے ہیں رواں
اشتراکی نے کہا

اک مورّخ نے کہا

چار سو وہ جلوہ پیرا شانِ نسلِ اکبری
وہ جہانگیری چمن سازی کا حُسنِ دلبری
عظمتِ شاہِ جہانی دلبری با قاہری
حکمتِ دارا شکوہی دلبری بے قاہری
اک مورخ نے کہا

(٦)

برف کی زُلف خم بہ خم ہاتھ میں اک پیالہ ہے
ہاں یہ پہاڑ ساقیِ سلسلۂ ہمالہ ہے
سرد ہیں گرمیاں یہاں، پھول ہیں دلستاں یہاں
کوہ کے پاؤں پر پڑا سبز سا اک دوشالہ ہے
گردِ یہ سب مکان اور ان کی چمکتی روشنی
گردِ کہن کے چاند کے نور کا ایک ہالہ ہے
دیکھ وہ گالف لنک کو صاف بہار لے گیا
ناچنے والے آگئے، زور پہ فصلِ لالہ ہے
آگئی ٹٹوؤں کی فصل، آگئی صاحبوں کی فصل
آج نوالہ لو نگل، کل وہی برف وژالہ ہے

ا؎ گلمرگ

(۷)

سندھ کی وادی عجب وادی نظر آئی مجھے

کوہسار و جوئبار و مرغزار و آبشار
کوہسار ایسے کہ جن میں حسن و دہشت ہمکنار
سبز پوش اور دیو ہیکل اور قطار اندر قطار

سندھ کی وادی عجب وادی نظر آئی مجھے

جوئبار ایسی کہ جو ہر ہر قدم پر بے قرار
سر پٹکتی، پھوڑتی سر پتھروں سے بار بار
تیز تیز اس کے قدم مغضوبِ جوش و زار زار

سندھ کی وادی عجب وادی نظر آئی مجھے

اور وہاں میں پہاڑوں کے ہرے سے مرغزار
لوٹ جاتی ہے نسیم صبح یوں بے اختیار
لیتی ہے گویا گیاہِ سبز کا ہلکا سا پیار

سندھ کی وادی عجب وادی نظر آئی مجھے

آبشار ایسے نہیں جن کو کہوں میں آبشار
بلکہ یوں کہئیے کہ چشمے ہو چکے ہیں بے قرار
جب نشیب آیا تھسل گرتے ہیں خود بے اختیار

سندھ کی وادی عجب وادی نظر آئی مجھے

اور آ گے ہیں صنوبر، یاں نہیں اُگتے چنار
کوہ کی وحشت میں حسنِ سبز کے پروردگار
قامتِ معشوق و قدِ سرو ہوں اِن پر نثار
سندھ کی وادی عجب وادی نظر آئی مجھے

ہاں چلا چل تا کہ سونا مرگ کی لوٹیں بہار
برف پوشوں کی سبھا میں اس پہ کچھ ایسی نکھار
جیسے دیووں بیں پری ۔ جادو نہیں حسن کا اُتار
سندھ کی وادی عجب وادی نظر آئی مجھے

— (۹) —

دیووں میں گھری ہے سبز پری [1]
اس سبز پری کے بال ہرے، اور اس کی رسیلی آنکھ ہری۔
کولو ہوئی اور زوجی لا
اور دیو بہت سے ان کے سوا
سر پر برفانی تاج دھرا، شوکت میں بھی اک آشفتہ سری
دیووں کو جو غصہ آتا ہے
سردی کا عالم چھاتا ہے
ہر بادل برف گراتا ہے، سورج نہیں کرتا دردسری
تب زردی موت کی چھاتی ہے
اور برف کفن پہناتی ہے
سبزے کو نیند آجاتی ہے، طاری ہے فضا پر بے خبری
آخر پھر سورج پچھتاتا
ٹیلوں کے جوبن گرماتا
پھیلا کر کرنوں کے پنجے
برفانی دامن سہلاتا، کرتا ہے آکر دادگری

[1] سونامرگ

لو برف کی سِل سینے سے ہٹی
وہ جسم پہ سبزی پھر سے جمی
چشموں کی نبضیں ہیں جاری، سیماب صفت پانی سے بھری
لو نرم ہوا پھر چلنے لگی
سبزے کی موج مچلنے لگی، وہ ناچ رہی ہے سبز پری
ہے سبز پری کی چال ہری
ہیں سبز پری کے بال ہرے، چشموں سے سر کی مانگ بھری
ڈالے ہیں فرنگی نے ڈیرے
قدرت کے تماشے دیکھے گا
کشمیری لایا ہے ٹٹو!
انعام اُسے مِل جاوے گا
اور سونا مرگ کی سبز پری دونوں کی کرے گی چارہ گری۔

(۹)

پہاڑوں کے اوپر وہ بارش مُسلسل
سڑک کی یہ حالت کہ چلنا بھی مشکل
پھسلتی چٹانوں میں کچھ برف شامل
مگر آ ہی پہنچے وُلر کے مُقابل
"خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے"

وُلر کی وہ جھیل، اس کے اطراف دلدل
مقابلِ شفق کی دہکتی سی مشعل
وہ ذخّار پانی میں طوفاں کی ہل چل
وہ دلدل کا لیکن جمودِ مُکمّل
"خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے"

وُلر کی یہ شوکت، یہ پانی کی وسعت
پہاڑوں کے آغوشِ سنگیں کی رفعت
وہ دلدل کی انسان سی پست حالت
وہ حُسن اور وہ عظمت، جمود اور ہیبت
"خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے"

ہے مشکل بہت، سوچنا اور سُنانا
پہاڑوں کے پیچھے ذرا ہو تو آنا
سُنو جا کے لولابیوں کا ترانہ
وہیں پھر رہا ہوگا اقبالِ دانا
"خصر سوچتا ہے وُلر کے کنارے"

— (۱۰) —

ہم سنتے آئے تھے عرصے سے، ہوتی ہے تجارت حُسن کی یاں
خادم خود لا کے بھڑاتے ہیں یاں بیوی، بیٹی، بہنیں، ماں
لیکن ہم یہ بھی سنتے تھے، کشمیری دھوکا دیتے ہیں
رنڈی کو لا کے بھڑاتے ہیں اور بیوی اس کو بتاتے ہیں
یاں آ کے ہم نے یہ دیکھا، گو حُسن یہاں بھی بکتا ہے
یہ کوئی انوکھی بات نہیں، ہر ملک میں یوں ہی بکتا ہے
پر ہندُستاں سے بہت زیادہ، یاں سچی شرم و حیا بھی ہے
دیکھا میں نے کشمیرن کو، پابندِ رسمِ وفا بھی ہے
یاں شرم و حیا ہے آنکھوں میں، یاں غربت میں خودداری ہے
یاں دِل میں جلوۂ عصمت ہے، یاں زخمِ محبت کاری ہے
اکثر دیکھا ہے، کشمیرن کم کم ہی آنکھ لڑاتی ہے
غربت ہی کا شاید ہے یہ اثر دِل شوہر ہی سے لگاتی ہے
سچی عصمت کہتے ہیں جسے، وہ عورت کی خودداری ہے
جس قوم میں یہ موجود رہے، لازم اس کی بیداری ہے
مغرب میں بہت دیکھا ہم نے، خودداری کی یہ شان نہیں
ایثار نہیں جس الفت میں، اس الفت میں ایمان نہیں

واں عشق کی مالا جپتے ہیں، اور زر کی پرستش کرتے ہیں
واں عشق و ہوس میں فرق نہیں، پھر اس کی ستائش کرتے ہیں
جس جنگ نے ساری دنیا میں اک آگ سی آج لگا دی ہے
اُس جنگ کے اصلی مقصد کی تاویل بہت سوں نے کی ہے
ہے ساری بحث کا یہ حاصل "یہ خوب رہی تم چین کرو
اور ہم بس یوں ہی سڑتے رہیں؟ ہاں لاؤ ہمارا حِصّہ دو
اور حصّہ کیا ہے زمین و زر۔ در کار مگر زن ہی کے لئے
ہیں یوں تو بہانے یاد بہت۔ بیکار ہے پر زن ہی کے لیے
بارود بھڑک کر کہتی ہے، ہاں غازہ زن کو زیادہ ملے
خوش خوش وہ سج بن کر آئے اور لطف بے اندازہ ملے
اولادِ اُمیّہ کی ڈوبی جب عیش بڑھا حد سے زیادہ
روما پہ بنا ہی چھا ہی گئی، ترکوں نے بھی بھگتا خمیازہ"
اے گوری چٹی کشمیرن، بد بُو سے لپٹی کشمیرن
اچھا ہے نہا کر کپڑے بدل۔ لیکن نہ بدلنا اپنا چلن

"ہاں، ہاں جمالدار
پھر کیا جمالدار؟"
اقبال ہے جناب کا۔ ہم کیا بتائے گا
یہ گھانس شانس چھیل کے ہم گھر کو جائے گا"
اور زرد زرد دانت
نکلے کہ مسکرا بھی رہے تھے جمالدار۔

بوڑھے جمالدار
اچھے جمالدار
سیدھے جمالدار
سِن ان کا ساٹھ سال کا، ڈارھی ذرا سی تھی
کپڑے بہت کثیف تھے، ٹوپی مگر نئی۔
"غربت اِدھر بہت ہے" یہ کہتے جمالدار
تھے پاس ہی کے گاؤں میں رہتے جمالدار
کچھ بکریاں تھیں جن کے لیے گھانس کھودنے
آتے جمالدار۔

"ہاں ہاں جمالدار
یہ تو بتاؤ کیسی ہے جانی جمالدار"
"اقبال ہے جناب کا اچھی ہے وہ جناب"
جانی جمالدار کی بیوی کا نام تھا۔
سن میں وہ اِن سے کم تھی مگر زرد زرد دانت
باقی نہ تھا کوئی۔
لڑکا جو تھا بڑا اسے مرگی کا مرض تھا
"اچھا جمالدار
کب تم کروگے لڑکے کی شادی جمالدار؟"
ہنستے جمالدار
کہتے جمالدار
"بیٹی یہاں اسے کوئی دیتا نہیں جناب"

القصّہ دوست ہو گئے میرے جمالدار
اپنی کبھی سُناتے حکایت جمالدار
کرتے گرانیوں کی شکایت جمالدار
روٹی کنگ کی پچتی نہیں کیا کرے جناب
شالی گراں ہے ملتی نہیں کیا کرے جناب"
اللہ کا غضب ہے کہ جنت میں قحط ہے

لکڑی کہیں نہیں۔
جنگل بہت سے ہیں۔
جانی کو کوئی کاش بس اتنا بتا سکے
لکڑی کہاں سے لائے کہ کھانا پکا سکے
فصلیں بھی ٹھیک تھیں
جنگل بہت سے ہیں
چاول بھی تھا بہت
لیکن کہاں گیا؟
لکڑی بھی ہے بہت
ملتی نہیں مگر
مہنگی ہے اس قدر
"پھر کیا جمالدار؟
پھر کیا کرو گے تم؟"
"ہم کانگڑی جلا کے کرے گا دعا جناب
قانون یہ خراب ہے قانون توڑ دے۔
باہر سے یہ جو آیا ہے، کشمیر چھوڑ دے۔"

عزیز احمد

سلک

اقبال

اردو شاعری

ادارہ ادبیات اردو

عزیز احمد

شلف

۲ مسل

اردو شاعری

ادارہ ادبیات اردو